



# حُسنِ تعبیر

## مفتی منیب الرحمن

مسلم افواج کے ترجمان جناب میجر جنرل آصف غفور کا پاکستان کی معیشت پر یہ تبصرہ: ”پاکستان کی معیشت اگر بہت بری نہیں، تو بہت اچھی بھی نہیں“ حقیقت کے مطابق بلکہ قدرے محتاط تھا۔ ہم جیسا کوئی آدمی تبصرہ کرتا تو شاید یہ کہتا: ”پاکستان کی معیشت اگر بہت بری نہیں تو کافی بری ہے“۔ لیکن ہمارا تبصرہ ایک عام آدمی کا تبصرہ ہوتا اور اس کی اتنی اہمیت نہ ہوتی، جبکہ ڈی جی صاحب کا تبصرہ مسلح افواج کا موقف سمجھا جاتا ہے، پس ٹائمنگ کا لحاظ ضروری ہے، نفسِ مضمون کوئی زیادہ مختلف فیہ نہیں ہے، اہل دانش کہتے ہیں: ”آدھا گلاس خالی ہے، منفی تعبیر ہے اور آدھا گلاس بھرا ہوا ہے، مثبت تعبیر ہے“۔ عربی کا مقولہ ہے: ”حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُفْرَبِينَ“، ترجمہ: ”خاص حالات میں جو بات عام مسلمان کے لیے نیکی کا درجہ رکھتی ہے، بعض اوقات مقربین بارگاہِ الہی کے شایانِ شان نہیں ہوتی“۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک موٹر سائیکل سوار کا خدا نخواستہ ایکسیڈنٹ ہوا، وہ سڑک کے درمیان زخمی پڑا تھا، کوئی درود دل رکھنے والا انسان آیا، اُسے سڑک کے درمیان سے اٹھایا، اس کی موٹر سائیکل کو اٹھا کر کنارے پر کھڑا کر دیا، اس کے کپڑوں کو جھاڑا، اسے پانی پلایا، جہاں سے خون رس رہا تھا، وہاں پٹی باندھ دی اور سڑک کے کنارے کسی سایہ دار جگہ پر لا بٹھایا۔ وہ شخص اس درد مند انسان کو دعائیں دے گا اور اس کا شکر گزار ہوگا۔ لیکن اگر اس کا کوئی قریب ترین عزیز یا جگری دوست اس کے ساتھ یہی سلوک کرے، تو وہ اس سے خوش ہونے کی بجائے الٹا ناراض ہوگا، کیونکہ اس سے وہ بجا طور پر یہ توقع رکھے گا کہ وہ اسے اسپتال لے جائے، چیک اپ کرائے، دوا کا اہتمام کرے، پھر اسے اُس کے گھر چھوڑ کر آئے اور اس کے بعد بھی خبر گیری کرتا رہے، پس: ”جن کے رتبے ہیں سوا، اُن کو سوا مشکل ہے“۔ ہر سچ بچ چوراہے کے نہیں بولا جاتا، ہم اپنی ذاتی یا گھریلو بہت سی سچی باتوں پر پردہ ڈالے رکھتے ہیں، ریاست کی حرمت اور مفاد ہماری ذات سے بہت بلند ہے، یہی بات ایک اور موقع پر ڈی جی صاحب نے بھی فرمائی تھی: ”ادارہ فرد سے بالا ہے اور ریاست ادارے سے بالاتر ہے“، پس ریاست کے مفاد میں احتیاط

لازم ہے۔ پھر انہوں نے وزیر داخلہ جناب احسن اقبال کے ردِ عمل پر وضاحت ضروری سمجھی، شاید یہ ان کے منصب اور ادارے کے وقار کا تقاضا ہو، لیکن اب یہ باب بند ہو گیا ہے تو سب کے لیے باعثِ اطمینان ہے۔ ہماری اعلیٰ سیاسی اور دفاعی قیادت نے ایک صف میں بیٹھ کر امریکی وزیر خارجہ ریکس ٹلرسن کے وفد سے مکالمہ کیا اور قومی موقف بیان کیا، اس سے پوری قوم اور دنیا کو ایک واضح پیغام ملا، کاش کہ ہمیشہ ایسا ہی ہو، یقیناً اس سے شیشے کے گھر میں بیٹھے ہمارے بعض دانش فروشوں کی حوصلہ شکنی ہوئی ہوگی۔

انہوں نے مزید کہا: ”نہ مارشل لا آرہا ہے اور نہ کوئی ٹیکو کریٹ حکومت آرہی ہے، جو سسٹم چل رہا ہے، اسے چلتے رہنا چاہیے، آئین سے بالاتر کوئی کام نہیں ہوگا۔“ البتہ انہوں نے وزیر داخلہ کے ردِ عمل پر دکھ کا اظہار کیا۔ انہوں نے مزید کہا: ”جمہوریت کو پاک فوج سے کوئی خطرہ نہیں ہے، البتہ عوامی امنگیں اور جمہوری تقاضوں کے پورا نہ ہونے سے جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“ اگر ہمارا جنرل صاحب سے براہ راست رابطہ ممکن ہوتا تو ہم ٹیلی فون پر ہی اُن سے اظہار خیال کر لیتے۔ بامر مجبوری ہمیں ان سے بالواسطہ مکالمے کے لیے کالم کا سہارا لینا پڑ رہا ہے، ہماری رائے میں انہیں یہ کہنا چاہیے تھا: ”جمہوریت کو کوئی خطرہ نہیں ہے، جمہوریت چلتی رہے گی، البتہ عوامی امنگیں اور جمہوری تقاضے پورے نہ ہونے سے حکومت کو خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔“

کیونکہ ہمیں جمہوریت کی یہی تو خوبی بتائی جاتی ہے کہ اس میں ڈیڈ لاک نہیں آتا، نظام موقوف یا معطل نہیں ہوتا، تسلسل قائم رہتا ہے، آمریت کے برعکس جمہوری نظام میں دستور کے اندر رہتے ہوئے تبدیلی کا راستہ کھلا رہتا ہے اور اس کے تین طریقے ہیں: ایوان کے اندر سے تبدیلی آجائے یا حکومتِ وقت خود قوم سے تازہ مینڈیٹ لینے کے لیے وسط مدتی انتخابات کا ڈول ڈالے یا منتخب حکومت دستور کے مطابق اپنی آئینی مدت پوری کرے اور اپنی کارکردگی کا ریکارڈ لے کر عوام کے پاس جائے۔ الغرض عوام ہی آزادانہ قومی انتخابات کے ذریعے اکثریتی ووٹ سے تبدیلی لانے کے مجاز ہیں کہ آیا اس حکومت کو دوبارہ موقع دیا جائے یا اسے تبدیل کر کے اس سے بہتر سیاسی جماعت یا قیادت کو اقتدار سونپا جائے۔ ان جمہوری اقدار کی راہ میں صرف ہم جو آمریاسیاست دان حائل ہوتے ہیں، ورنہ نظام جیسے تیسے چلتا رہتا ہے، کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ چوتھا طریقہ وہی ہے جو ہمارے ملک میں 1958، 1969، 1977 اور 1999 میں وقفے وقفے سے آزمایا جاتا رہا اور ناکامی سے دوچار ہوا، فرق یہ ہے کہ معزول یا ناکام سیاست دان دوبارہ عزت و وقار کے ساتھ قوم کے درمیان اپنا مقام بنا لیتے ہیں، جبکہ آمر کی باعزت واپسی کی کوئی مثال ہماری تاریخ میں موجود نہیں ہے، خواہ جناب جنرل پرویز مشرف کی طرح وہ خود کو دانشِ عصر کا امام اور اپنے مقابل سب کو احمق ہی سمجھتا ہو۔

پس دستور کے مطابق قومی انتخابات کے ذریعے حکومت کی تبدیلی کا راستہ کھلا رہتا ہے، یہی جمہوریت کا مثبت پہلو ہے، ورنہ آمریت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وقفے وقفے سے تحریکیں چلانی پڑتی ہیں، ملک افراتفری اور غیر یقینی حالات سے دوچار ہو جاتا ہے، معیشت کا پھیلاؤ جام یا ست رفتار ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت حال سیاسی و معاشی عدم استحکام کا باعث بنتی ہے، کیونکہ ملکی و غیر ملکی سرمایہ کار غیر یقینی حالات کی وجہ سے سرمایہ کاری کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، سرمایہ دار ایک اڑتی چڑیا ہے، اس کی قوت



شامہ بہت تیز ہوتی ہے، جہاں اُسے جان کے خطرے اور سرمائے کے ضیاع کی بومحسوس ہو، وہ وہاں سے ہجرت کر جاتی ہے اور نیا آشیانہ ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگاتی، اس کے لیے ممالک کی سرحدیں بے معنی ہوتی ہیں۔ دنیا کا ہر ملک سرمایہ دار کے استقبال کے لیے اپنا دیدہ و دل کشادہ رکھتا ہے، حال ہی میں عہد حاضر کی ایک طاقت ور معیشت چین کے طاقتور صدر نے اپنے ملک کی حکمران جماعت کمیونسٹ پارٹی کی انیسویں کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”ہم اپنے ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کے لیے امکانات اور مواقع کو اور وسیع کریں گے“۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے وقت بیس بڑے سرمایہ دار خاندانوں کو نشانہ بنایا تھا، پھر 1972 میں صنعتوں کو قومیا لیا گیا، اس کے بعد اکثر صنعتکار ملک سے چلے گئے اور دوسرے ممالک میں جا کر اپنے کاروبار جما لیے، پاکستان سے سرمائے کی یہ اڑان اب بھی جاری و ساری ہے، کہا جاتا ہے کہ سینکڑوں ارب ڈالر پاکستان سے باہر چلے گئے۔

جمہوری نظام کے تسلسل کو نو سال ہو چکے ہیں، لیکن ہم ”دودھ کا جلا چھا چھ بھی پھونک کر پیتا ہے“ کا مصداق بنے رہتے ہیں، 1977 میں حکومت مخالف تحریک کے موقع پر چیف آف آرمی اسٹاف جناب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم سمیت بحری اور فضائی افواج کے سربراہان نے ریڈیو پاکستان پر آکر منتخب جمہوری حکومت کی پشت پناہی اور حمایت کا یقین دلایا تھا۔ لیکن پھر 5 جولائی 1977 کو عہد شکنی کر کے اقتدار پر قابض ہو گئے اور پاکستان قومی اتحاد کی قیادت منہ بکتی رہ گئی۔ اسی طرح جنرل پرویز مشرف نے 12 اکتوبر 1999 کو ایک بار پھر منتخب جمہوری حکومت کی بساط پلیٹ دی۔ فرق یہ ہے کہ بعض مذہبی عناصر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے حامی رہے اور جنرل پرویز مشرف کے دور حکومت میں لبرل عناصر ان کے ہمنوا رہے، وہ آج بھی جنرل محمد ضیاء الحق کو علانیہ دشنام کا ہدف بناتے ہیں اور ظاہر آباد بے لفظوں میں جنرل پرویز مشرف کا ذکر خیر کرتے ہیں۔

پہلا پتھر کون مارے:

آج کل ہمارے وطن عزیز میں صادق و امین اور کاذب و خائن کی بحث جاری ہے، ہر ایک کے اپنے اپنے معیارات ہیں۔ ایک معیار سیرت عیسیٰ علیہ السلام سے بائبل کی مندرجہ ذیل روایت میں بیان کیا گیا ہے:

”اور فقیہ اور فریسی اس عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا: اے استاد! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے، تو رات میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں۔ پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے؟۔ انہوں نے اُسے آزمانے کے لیے یہ کہا تا کہ اُس پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں، مگر یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔ جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے، تو اُس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا: جو تم میں بے گناہ ہو، وہی پہلے اس کو پتھر مارے، (انجیل یوحنا، باب: 8، آیات 3-8)۔“ پس پتھر اٹھانے سے پہلے اپنے دامن پر ایک نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(روزنامہ دنیا، 28 اکتوبر 2017ء)